© rasailojaraid.com

50

قیادت کا امتحان

قائدانہ اوصاف کی فہرست طویل ہوتی ہے۔ ہر اچھی صفت کا بدرجہ کمال موجود ہونا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ عملی دنیا میں قیادت کا امتحان اُس کے فیصلوں اور رویوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہر قائد اپنے تشخص کو بتدریج اجاگر کرتا ہے اور پھر اُس کے مطابق چلتا ہے۔

درج ذیل چار صورتوں میں قیادت کا امتحان سخت ہوتا ہے اور کمال کے حصول میں اہم کردار ادا کرتا ہے:

- **تبدیلی اور پھر واپسی:** تبدیلی ہمیشہ سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے اور تبدیلی لاتے ہوئے بہت کچھ کر گزرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب تبدیلی کے نتائج توقع سے کہیں کم نظر آئیں تو ایسے موقعے پر نیا فیصلہ چاہیے ہوتا ہے یا پرانی حالت میں واپسی ضروری ہوتی ہے۔ اس نوعیت کی اصلاح کے لیے حوصلہ درکار ہوتا ہے۔
- **استقلال:** تنظیم کی اٹھان اور ترقی جن بنیادوں پر ہوتی ہے اُن کا دفاع اور اُن کا احیا ضروری ہوتا ہے تاکہ ترقی کی راہیں مزید کھلتی جائیں۔ نتائج کے لیے بے صبری کی وجہ سے تبدیلی کا شوق اگر بنیادوں کو مضمحل کر دے یا جڑوں کو کاٹ ڈالے تو یہ بہت برا سودا ہے۔ بنیادی اصول، مقاصد، اقدار پر استقلال قیادت کے کمال مرتبے کو ظاہر کرتا ہے۔
- **اَن کہے پر گفتگو:** اگر ٹیم کے کسی رکن کے ساتھ کسی موضوع پر بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہو یا جس موضوع پر بات کرنا جذباتی طور پر مشکل محسوس ہوتا ہو تو اُسی پر بات کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے موضوع کو ٹالنا نہیں چاہیے۔ شاید وہی موضوع ایسا ہے جس پر کھل کر بات ہونا چاہیے اور مسئلہ وہیں اٹکا ہوا ہے۔ قیادت کا امتحان اسی میں ہے۔
- **تنظیم اور لچک:** تنظیم کا قائد غیر یقینی کو یقینی سے بدلتا ہے۔ پابندی اور سختی کے ذریعے سے یہ ممکن ہوتا ہے لیکن حالات اور کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے نتائج کو مدنظر رکھ کر لچک اختیار کرنا بھی قیادت کا بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اس لچک کا مقصد انتشار سے بچنا اور تنظیم کو فعال اور مؤثر بنانا ہوتا ہے۔

مشعل العلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج ـــــ تاریخ کے آئینے میں

آبادشاہ پوریؒ

امام غزالیؒ کا دور فلسفہ و تعقل پرستی کا دور تھا۔ یونانی فلسفیوں کی کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات، جو عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، مسلمانوں کی فکرو ذہن کو بری طرح متاثر کر رہی تھیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے دین و شریعت اور اصول و عقائد، کوئی چیز محفوظ نہ رہی تھی۔ دینی اصطلاحات کو نئے نئے معانی پہنائے جا رہے تھے۔ آیاتِ قرآنی کی نئی نئی تعبیریں کی جا رہی تھیں، جو بات عقل اور فلسفے پر پوری اترتی صرف وہی قابلِ قبول ہوتی اور باقی ہر شے لائق استرداد قرار دی جاتی۔ دوسری طرف باطنیت کا فتنہ عروج پر تھا جس نے فلسفے کی آوارہ خیالی، لذتیت پرستی اور رفض و تشیع کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ باطنیت محض ایک فکری رویہ نہ تھا اور وہ مسلمانوں کے فکر اور عقیدے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک نیا علم کلام اور دین و شریعت کی نئی تعبیرات ہی پیش نہیں کر رہا تھا، بلکہ وہ ایک سیاسی رویہ بھی تھا۔ باطنی عالم اسلام کی سیاسی زندگی کو تلپٹ کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے اور ان کے خنجر سے عالم اسلام کا کوئی توانا اور متحرک دینی و سیاسی رہنما اور عالم و صالح شخص محفوظ نہ تھا۔ فلسفہ اور باطنیت کی ان دو بلاؤں کے درمیان مسلمان ذہنی انتشار میں مبتلا حیران و پریشان کھڑے تھے۔ مسلمانوں کے دانش ور طبقے کے ایک بڑے عنصر کا رجحان فلسفے کی طرف تھا۔ باطنیت سے دانش وروں سے زیادہ خوش عقیدہ عوام الناس اور عام پڑھا لکھا عنصر مرعوب و متاثر تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ دین کی گرفت ذہنوں اور اعمال پر ڈھیلی پڑ گئی۔ دینی افکار و عقائد کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ دین کو زمانے کے جدید ترین تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اس کی تراش خراش شروع ہوگئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کے خلاف ایک بغاوت عام برپا تھی جس سے کوئی طبقہ محفوظ نہ تھا اور وہ جن پر دفاع دین کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی یا تو خود اس سیلاب بلاخیز میں بہہ رہے تھے اور زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز کا درس دے رہے تھے، یا بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں مسجدوں کے حجروں اور مدرسوں کی چار دیواریوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اس فساد کے آگے کھڑا ہونے اور اپنے دین کا دفاع کرنے کی توفیق اللہ نے اپنے جس بندے کو دی وہ امام غزالیؒ تھے......

انھوں نے یونانی فلسفے کے تناقضات پر اسی کے نقطۂ نظر سے تنقید کی، اس کی کمزوریوں کو آشکارا کیا، اور استدلال کی قوت سے ان کے افکار و تخیلات کی بے مایگی ثابت کی۔ اس طرح فلسفۂ یونان کے اس رعب و طلسم کو توڑا جس کا مسلمانوں کا دانش ور طبقہ بری طرح اسیر ہو چکا تھا۔ اب تک فلسفہ اور اس کے نظریات پر دفاعی انداز میں تنقید کی جاتی رہی تھی۔ امام پہلے فرد ہیں جنھوں نے مدافعانہ لہجے کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کیا۔ اسی طرح علما کے اندر اس کے مقابلے میں جو احساس کمتری اور نفسیاتی عدمِ استحکام پیدا ہو گیا تھا، اسے نہ صرف دُور کیا بلکہ ان کے اندر اپنے عقائد و افکار پر اعتماد و یقین پیدا کیا۔ عقلیت پرستی کے تار و پود بکھیرے اور اسلام کے اصول و عقائد کو عقلیت پرستی کے نام پر جس طرح توڑا اور مسخ کیا جا رہا تھا، جس کے نتیجے میں بے اعتقادی جنم لے رہی تھی، اس کا گہرا تجزیہ کیا اور مسلمانوں کو عقلی استدلال کے ذریعے بتایا کہ تمھارے دینی عقائد کا اثبات نام نہاد معقولات کو اپنانے پر منحصر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی باطنیت کی فکری و سیاسی بنیادوں پر ضرب کاری لگائی جس نے بظاہر ایک نیا فلسفہ اور علمِ کلام اور نئی اصطلاحات وضع کر لی تھیں لیکن درحقیقت جس کی شاخیں یونانی و عجمی فلسفے کی جڑوں ہی سے پھوٹی تھیں۔

مسلمان معاشرے کے ایک ایک طبقے پر کڑی تنقید کی اور ان اسباب و عوامل کی نشان دہی کی جو مسلمانوں کے دینی و اخلاقی انحطاط و زوال کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ امام کے نزدیک مسلمان معاشرے میں پھیلی ہوئی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں اور مفاسد کے سب سے بڑے ذمہ دار علما اور حکمران تھے۔ انھوں نے ان دونوں طبقات پر کڑی نکتہ چینی کی، خصوصاً علما کی کمزوریوں اور ذمہ داریوں پر سیر حاصل تنقید و تبصرہ کیا۔ مزید برآں دولت مندوں اور عوام الناس کے کردار و اعمال کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ اس طرح پورے نظامِ اجتماعی کے مفاسد، اس کی کمزوریوں اور امراض کی نشان دہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اور اس میں نہ کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا کی اور نہ کسی مصلحت اور خوف کو خاطر میں لائے......

امام غزالیؒ دوسرے تمام ائمہ وصلحا کی طرح زاہد و متورع تھے۔ بڑے بے باک اور حق گو۔ ان کا زمانہ مطلق العنان بادشاہوں کا زمانہ تھا جنھوں نے اپنے آپ کو قوانین سے بالاتر قرار دے لیا تھا۔ ان پر اعتراض کرنا' اپنے آپ کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف تھا' لیکن امام نے پوری جرأت کے ساتھ بادشاہوں' ان کے حکام اور نظامِ حکومت پر کھلے عام تنقید کی۔ ان کی ایک ایک کمزوری اور کوتاہی پر گرفت کی۔ یہ سلاطین و حکام لوگوں کے ضمیر بھاری عطیات اور مناصب دے کر خریدا کرتے تھے۔ اس خرید و فروخت میں بڑے بڑے علما اور مشائخ حصہ لیتے اور اس میں ذرہ برابر کراہت محسوس نہ کرتے۔ امام غزالیؒ نے اس پر سخت تنقید کی اور سلاطین و حکام کے اموال کو ناجائز اور حرام قرار دیا' چنانچہ احیاء علوم الدین میں لکھتے ہیں: ''بادشاہوں کے مال آج کے زمانے میں بالعموم حرمت سے خالی نہیں ہیں۔ حلال مال ان کے پاس یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے''۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> آج سلاطین انھی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں جن کے بارے میں انھیں اُمید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے' ان کے لیے سہارا بنیں گے اور ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے۔ ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی اور وہ ہمیشہ دعاگو' ثناخوانی اور حاضر و غائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے ___ اگر کوئی شخص اس کے لیے تیار نہیں ہوتا تو خواہ وہ امام شافعیؒ کے مرتبے کا ہو' یہ سلاطین ایک پیسہ بھی اس پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے۔ اس لیے بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہو کہ وہ حلال ہے' اس لیے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس مال کا کیا مذکور جس کے متعلق حرام یا مشتبہ ہونا صاف ظاہر ہے......

امام غزالیؒ کے اپنے عہد پر اثرات کا ایک اور اہم پہلو دیکھا جا سکتا ہے۔ امام صاحب کو ان باتوں (یعنی بگڑے ہوئے حکمرانوں پر تنقید وغیرہ) پر تسلی نہ تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے اس لیے جب تک اسلامی اصول کے موافق

© rasailojaraid.com